© rasailojaraid.com

مقالات

دعوت کے طریقے

از جناب مولانا امین احسن صاحب اصلاحی

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پر ٹوپی۔ گاؤں گاؤں پھرے، اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے، خواہ وہ سنے یا نہ سنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گذر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چوراہے پر چار آدمی نظر آجائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے۔ ریل میں، اسٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے، ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کرے، ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے۔ سننے والے تھک تھک جائیں لیکن وہ سنانے سے نہ تھکے، لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک کے سر پر مسلط رہے، لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں اور بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں لیکن وہ اسی جوش و انہماک کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی ضرورت ہو وعظ کہے، جہاں میلاد کی خواہش کی جائے میلاد پڑھ دے اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے وہاں خم ٹھونک کے میدان مناظرہ میں بھی اتر پڑے۔ یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ اور یہ ہے ایک سچے مبلغ کی صحیح تصویر جو ہمارے بہت سے دیندار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹفک طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے کے ممکن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں لیکن خیر و برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے جس کو ان کے خیال میں حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ (جس کے سوا کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت سے وہ محروم ہیں) ایک محترم و مقدس طریقہ ثابت ہو جائے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے آج کی صحبت میں ہم بتائیں گے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ بدلتے رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے بلکہ داعیانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن سے اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنایا جا سکتا ہو۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں، جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقہ پر اصرار نہیں کیا ہے بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم و فن ترقی کرتا گیا ہے اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ و تعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دورِ تمدن میں جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا انبیاء کی تعلیم و تبلیغ بھی زبانی تھی۔ وہ نیکی اور سچائی کے کچھ اصول لوگوں کو زبانی آکر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے جو نسلاً بعد نسلٍ روایات کی شکل میں ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امتدادِ زمانہ سے وہ اصول فراموش ہو جاتے یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہو جاتیں تو اللہ تعالیٰ کسی اور نبی کو بھیجتا جو آکر اس تعلیم کو از سرِ نو تازہ کر دیتا۔ جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملہ میں سارا اعتماد شخصی ارتباط، زبانی اظہار اور قوتِ حافظہ پر رہا لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا جس نے ایک حد تک انسان کو ان چیزوں سے مستغنی کر دیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور ان کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہو گیا تو انبیائے کرام نے اس کو بھی اختیار فرما لیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے تورات کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم قلم کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ   اور تو پڑھ، اور تیرا خداوند وہ فیاض خدا ہے جس نے قلم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۳-۵ علق) نے تعلیم دی اور انسان وہ چیز سکھائی جس سے وہ نا آشنا تھا۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ انسان کو قلم کے استعمال کا اس نے ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیم دین کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے وہ اس لائق ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ــــ کتاب ــــ کے پانے کا مستحق ہو۔ زبانی تعلیم کے مقابل میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح حاصل ہے اور اس میں اتمام حجت اور تبلیغ کامل کے جو پہلو ہیں ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کیے ہیں لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاء کا طریقہ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہی ہے جس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق داعیان حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس اور ریڈیو وغیرہ نے انسان کی قوت ابلاغ کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جا سکتا ہے، مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام اور خواص سب کے ذہن نشین کی جا سکتی ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہل حق یہ خیال کر کے ان چیزوں کو نظر انداز کر دیں کہ انبیاء نے تبلیغ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے بلکہ دروازہ دروازہ پر پہنچ کر ایک ایک شخص پر تبلیغ کی ہے اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ گھر گھر پہنچ کر لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیاء کے طریقہ کی پیروی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہے جو وہ اس لیے دے رہا ہے تاکہ جب تک آپ اپنے "دیندارانہ" طریقہ پر چل کر دو چار آدمیوں سے کوئی بات کہیں ـ اس وقت تک وہ ان سائنٹفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں تک اپنی دعوت باطل نہایت مؤثر طریقہ پر پہنچا دے۔ شیطان نے یہی دھوکہ دے کر اکثر اہل حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہنچا دیا ہے اور ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقابل میں خود اپنا پلہ بھاری رکھا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں یہ پیچھے ہیں اور وہ آگے ہے اور دونوں کی کوششوں کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور یہی صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اہل حق ان زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فی فیصدی شیطان کے تصرف میں ہونے کی وجہ سے باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

۲- دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹفک نقطہ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیے تاکہ باطل سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس کام میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ دعوت وقت کے معیار کے لحاظ سے باوقار ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے خیالات کو سنانے اور دوسروں کے خیالات کو سننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہوں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہ ہو، تو اہل حق ان کو اپنائیں اور تبلیغ حق میں ان سے کام لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں ترقی پا چکے تھے اور دعوت کے نقطہ نظر سے کارآمد تھے۔ اول اول جب آپ نے اپنے خاندان کے اکابر کو ـــــ جو درحقیقت وقت کے بھی اکابر تھے ـــــ اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو اس کے لیے طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو اور تمام خاندان مطلب کو کھانے پر بلاؤ۔ حضرت علی نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندان مطلب جمع ہوا۔ حضرت حمزہ، ابو طالب اور عباس سب لوگ شریک ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ "اس بار گراں کو اٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟" اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اٹھ کر نہایت موثر الفاظ میں فرمایا کہ "گو مجھ کو آشوب چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلعم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے مثلاً مکہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے۔ حج کے زمانے میں جو قبیلے مکہ کے آس پاس آکے ٹھہر جاتے آپ ان کے سرداروں سے ملتے اور ان کو دعوت اسلام دیتے۔ بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے۔ عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جاتے تھے، آپ ان بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے۔ بہت سے لوگوں کو آپ نے خطوط کے ذریعے بھی دعوت دی۔ غرض اس زمانہ میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے فائدہ اٹھایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عہد میں لوگ انہی طریقوں سے مانوس ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکتے ہیں اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں انہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے طبائع اور حالات کے مناسب ہیں۔ جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں اسی طرح ان کو سنانے کی کوشش کی جائے، جس طریق کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اسی طریق کار کو اختیار کیا جائے۔ اگر ایک داعی ــــ بالخصوص ایک داعی حق ــــ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے اس کے نزدیک وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی ہے اور اس کی مخلصانہ کوششوں کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجام سے نہ بچا سکے گی۔ اگر ایک شخص آج دعوت دین کے لیے یورپ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس بات پر مصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا تو خواہ یہ شخص کتنا ہی مخلص ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے اپنی محنت بھی رائگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزت بھی خاک میں ملائے گا اس سلسلہ میں ایک داعی حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں کوئی پہلو اخلاق کے منافی ہو۔ اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار ہی کرنا پڑ جائے تو اس کو اس اخلاقی برائی سے پاک کر لے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اول اول اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہ صفا پر چڑھ کر جو نعرہ لگایا اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانیوالا اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہو جاتا تھا، چنانچہ عربی میں اس کو "النذیر العریان" کہتے بھی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چوکنا کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیر عریان کا ہوتا تھا لیکن عریاں ہونا چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی تھی اس وجہ سے آپ نے اس برائی سے اس طریقہ کو پاک کر لیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہو چکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو برائی کا ہے تو اس برائی کی وجہ سے ان کو مکمل رد کر دینا کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ کرنا یہ چاہیے کہ ان طریقوں کو برائیوں سے پاک کر کے ان کو مقصد حق میں استعمال کیا جائے۔

آج متمدن ملکوں میں کسی فکر کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہو چکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں اسی طرح بھلائیوں کے پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ یا تو ان کو ان کی تمام موجودہ خصوصیات کے ساتھ اختیار کرتے ہیں خواہ کسی مقصد حق ہی کے لیے استعمال کریں یا اس خیال سے سرے سے ان کو ہاتھ ہی نہیں لگانا چاہتے کہ ان میں بعض پہلو برائی کے بھی ہیں۔

یہ وہ اصولی ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق لحاظ رکھنے کی ہیں جو ایک داعی حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کرینگے جن سے بہر حال ایک داعی حق کو احتراز کرنا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا مفاد کے خلاف ہوں بہت سی ہوسکتی ہیں۔ ان سب کو گننا مشکل ہوگا صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے جن سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ داعیان حق کو کس قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

الف۔ ایک داعی حق کو استمالت کے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے جن سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اس حد تک نہیں بڑھنا چاہیے کہ داعی کو نہ اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش رہے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا کچھ خیال رہے، اور نہ اپنی دعوت کے مرتبہ اور مقام ہی کی کچھ پروا رہ جائے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانے کے درپے ہونا، بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال کا نہ پیدا ہونے پائے۔ اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو اس حد تک جھکنے پر مجبور کر رہی ہے اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔ سورہ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلعم کو متکبرین کی اسی طرح کی استمالت سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا ذکر اسی پہلو سے ہے۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی	لیکن جو بے پروائی برتتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو حالانکہ
عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی	تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر وہ اپنے آپ کو نہ سدھارے
وَھُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْہُ تَلَھّٰی کَلَّآ اِنَّھَا تَذْکِرَۃٌ	اور وہ جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور اپنے خدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ

(۵-۱۶ عبس)

ہرگز نہیں یہ تو بس ایک یاددہانی ہے سو جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھائے ہیں معزز، بلند رتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوفا منشیوں کے ہاتھ سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے یا چمٹنے والے گداگروں کی طرح جو راہ گیر مل جائے اس کے پیچھے پڑ جائے اور جب تک اس کو سنا نہ لے یا اس سے کچھ سن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ:

ولا الفینك تاتی القوم وهم فی حدیث من حدیثهم فتقص علیهم ولكن انصت فاذا امروك فحدثهم وهم یشتهونه

(بخاری)

میں تمھیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی قوم کے پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں ہوں اور اسی حال میں تم ان کو سنانا شروع کر دو بلکہ خاموش رہو اور جب وہ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں۔

عن شقیق قال كان عبد الله بن مسعود یذكر الناس فی كل خمیس فقال له رجل یا ابا عبد الرحمن لوددت انك ذكرتنا فی كل یوم قال اما انه یمنعنی من ذلك انی اكره ان املكم وانی اتخولكم بالموعظة كما كان رسول الله صلى الله علیه وسلم یتخولنا بها مخافة السامة علینا

شقیق سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبدالرحمن میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہا کریں۔ انھوں نے کہا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کرکے تمھیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح آنحضرت صلعم ہم کو ناغہ کرکے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔

ب۔ داعی حق کو کبھی کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے دعوت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد کے بالکل منافی ہو مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدت سے دعوت و تبلیغ کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہمارے اہل فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں جو ہمارے عربی مدرسوں میں پڑھائی بھی جاتی ہیں لیکن دعوت حق کی روح سے جس قدر بعید یہ طریقہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجہ کی اجازت دی ہے لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا جس کی تعلیم ہماری دینی درسگاہوں میں دی جاتی ہے اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے اہل مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے انہی دو لفظوں سے ہے اس وجہ سے ہم مختصراً ان دونوں لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ انبیا کے مجادلہ اور محاجہ اور مروجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن شریف میں دو طرح کے مجادلہ کا ذکر آتا ہے، ایک مجادلہ باطل، دوسرا مجادلہ حسن۔ مجادلہ باطل کو قرآن نے کفار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں پر گرفت، وہی بے فائدہ کج بحثیوں میں تضییع وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا، وہی لایعنی موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں کی خصوصیات ہیں شامل ہیں وہی قرآن نے مجادلہ باطل کی خصوصیات بھی بتائی ہیں اور اہل حق کو نہایت سختی کے ساتھ ان سے روکا ہے اور صرف احسن طریقہ سے مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ کی وضاحت علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے خود کر دی ہے تاکہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک و اتحاد ہے اس مشترک پہلو کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اپنے اقرار کردہ اصول سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کی طرف مائل ہو۔ مثلاً فرمایا:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶۔ عنکبوت)

اور نہ مناظرہ کرو اہل کتاب سے مگر اس طریق سے جو بہتر ہے اور جنھوں نے ان میں سے اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کو تو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ اور کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور ہمارا تمھارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

اسی اصول کے اہتمام میں اہل کتاب کے سامنے توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ جب اہل ایمان اور اہل کتاب میں بحیثیت اصول کے یہ چیز یکساں طور پر مسلم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم کوئی اختلاف کیوں ہو!

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (۶۴۔ آل عمران)

کہہ دو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان مسلم ہے وہ یہ کہ ہم نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ بنائیں کسی چیز کو اس کا ساتھی اور نہ بنائے ہم میں سے کوئی کسی کو رب اللہ کے سوا۔ پس اگر وہ (اس کے مقتضیات) سے اعراض کریں تو اعلان کر دو کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے مخاطب پر محبت، اعتماد، حسن اخلاق اور حسن استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بےلوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطور مثال ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پر محبت اصرار و اظہار کو مجادلہ کے ... سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے ...

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے جو مجادلہ کیا ہے قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ مجادلہ ان کی دردمندی اور دل سوزی کا نتیجہ تھا۔ اس مجادلہ کی تفصیل تورات میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

تب ابرہام نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ملیں تب اس نے کہا میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا میں اسے بیس کی خاطر بھی نیست نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں اس نے کہا میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابرہام اپنے مکان کو لوٹا۔" (پیدائش ۱۸: ۲۳-۳۳)

اس طرز کلام، اس طرز تخاطب اور اس طرز استدلال و اصرار کو قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے اور اس مجادلہ کی تعریف فرمائی ہے۔ اگر لوگ انہی مجادلوں کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل قرار دیتے ہیں تو چاہیے کہ جو روح اس مجادلہ کے اندر ہے وہی روح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی لطف و محبت اور دل سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں نہ کہ سارا اہتمام رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور اس کا نام رکھ لیا جائے مناظرہ اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاء کی زندگی سے

© rasailojaraid.com

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک محاجہ بھی نقل فرمایا ہے جو ایک بادشاہ اور ان کے درمیان ہوا ہے اس محاجہ کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے" اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ "میں مارتا اور جلاتا ہوں" اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال"۔ اس مناظرہ کو اگر مناظرہ کے اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ "میں مارتا ہوں اور جلاتا ہوں" بہت کچھ معارضہ کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیا بلکہ جونہی ان کے سامنے یہ حقیقت آئی کہ یہ شخص مناظرہ اور اپنی بات کی پیچ کرنے پر تل گیا ہے وہ ایک مسکت بات کہکر فوراً علیحدہ ہو گئے جس سے فی الجملہ اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعی حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا و سمجھنا نہیں چاہتا بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اتر آیا ہے تو اس کے منانے کے درپے نہیں ہونا چاہیے بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے۔

ایک ضروری معذرت

اس پرچہ میں "زکوۃ" والے مضمون کی قسط نہیں پیش کی جا رہی ہے۔ مجبوری یہ ہے کہ اعداد و شمار کے متعلق جن کتابوں کی ضرورت تھی۔ وہ خلاف توقع بروقت نہیں مل سکیں۔ ضروری کتابوں کے مہیا ہو جاتے ہی اس سلسلہ کو مکمل کر دیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔

(نعیم صدیقی)

© rasailojaraid.com